علم کلام کے بنیادی مصادر اور مستشرقین کی آراء: تجزیاتی مطالعہ

Basic Sources of *'ilm al Kalām* and the Thoughts of Orientalists: An Analytical Study

* ڈاکٹر جنید اکبر

** ڈاکٹر محمد اکرام اللہ

Abstract

This article attempts to discover the basic sources of 'ilm al Kalām and to find answer to the question that whether 'ilm al Kalām and its dialectical techniques have been borrowed from Christian and Latin theology? It is clear that the codification of 'ilm al Kalām and related writings started from the second Hijra and still continues but very little efforts have been made about the underlying factors about the fundamental sources and evolution of 'ilm al Kalām. The article also focuses on to find out the originators of 'ilm al Kalām and their works from the sources of Islamic history. The article concludes that 'ilm al Kalām and its origin did not find its roots in Christianity or Latin theology, but like other Islamic sciences is a result of the intellectual efforts of Muslim themselves who laid its foundations on the standards derived from the Qur'ān, the Sunnah and the sayings of Companions of the Prophet Muhammad (SAW). The research substantiates that Imām Abū Ḥanīfa is the real founder of 'ilm al Kalām, who wrote five books on the subject in the second year of Hijra, most of which are not only famous among Muslims scholars, but are also included in the curriculums of many famous universities and religious seminaries.

علم کلام کے مسائل کے بارے میں کتب اور رسائل کی تصنیف و تألیف کا سلسلہ دوسری صدی ہجری سے شروع ہو کر عصر حاضر تک جاری ہے۔ مگر بہت کم ہی علم کلام کے بنیادی مصادر اور اس کی تدوین و ارتقاء کے اساسی عوامل کے بارے میں لکھا گیا۔ خصوصاً اردو زبان میں ان جیسے مباحث کا وجود انتہائی نادر ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ و دینیہ، جامعہ ہری پور

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ و دینیہ، جامعہ ہری پور

اس لیے اس مقالہ میں علمِ کلام کے عوامل اور ان مصادر کے بارے میں بحث ہو گی جن کے اثرات علمِ کلام کی تدوین وارتقاء پر واضح طور پر مرتب ہوئے۔

اس مقالے کا دوسرا اہم ہدف اس بات کی تحقیق کرنا ہے کہ اس علم کا مدوّن اوّل کون ہے، اور کون کون سی کتب ممکنہ طور پر علم کلام کی اولین کتابیں کہلائی جا سکتی ہیں؟!اور اس بارے میں قدیم اور جدید محققین کے مشہور اقوال کا محاکمہ کر کے ایک محقق رائے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علمِ کلام اور مستشرقین:

علمِ کلام کے بنیادی مصادر کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کیا علمِ کلام کا وجود اسلامی ماحول کی پیداوار ہے اور متکلمینِ اسلام کا خاصہ ہے یا اس کا وجود خالص خارجی اثرات کا عکس ہے؟!! کیونکہ دورِ حاضر میں یہ بات متعدد علمی محافل میں زیرِ بحث ہے کہ کیا علم کلام ایک خالص اسلامی مضمون ہے، جس کی پیدائش اور نشوونما ایک اسلامی ماحول میں ہوئی؟ یا یہ علم یونانی کتب کو عربی میں نقل کرتے ہوئے وجود میں آیا بلکہ صاف الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ یہ علم، محض فلسفہ کے علم الٰہیات اور علم منطق کے مقدمات کا لے پالک ہے۔ جب کہ کچھ مستشرقین جیسے Josef van Ess[1] اور Carl Heinrich Becker[2] وغیرہ[3] یہ سمجھتے ہیں کہ علمِ کلام کی بنیاد، نہ صرف قدیم عیسائی عقائد و نظریات سے متاثر ہو کر پڑی بلکہ اس کے اصول و منہج بھی عیسائیت اور یونانی فلسفہ کے مطابق ہیں[4]۔

مستشرقین میں سب سے پہلے ٹی جے دی-بور (T. J. de Boer) نے ۱۹۰۱ء میں اس بات کی پر زور الفاظ میں ترجمانی کی کہ عیسائیت کے علمِ کلام کے اوپر بہت گہرے اثرات ہیں، بلکہ علمِ کلام کا عیسائیت سے بلا واسطہ تعلق ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "The similarity between the oldest doctrinal teachings in Islam and the dogmas of Christianity is too great to permit any one to deny that they are directly connected. In particular, the first question about which there was much dispute, among Muslim Scholars, was that of the Freedom of the Will. Now the freedom of the will was almost universally accepted by Oriental Christians. At no time and in no place perhaps was the Will-problem - first in the Christology, but afterward in the Anthropology - so

much discussed from every point as in the Christian circles of the East at the time of the Muslim conquest." [5]

پھر سولہ (۱۶) برس بعد ۱۹۱۷ء میں دی-بور نے مزید تین مسائل (مسئلہ خلقِ قرآن، مسئلہ صفات اور خالق کا مخلوق اور عالم سے رابطہ) کے بارے میں کہا کہ یہ عیسائیت سے ماخوذ یا متاثر ہیں[6]۔ دی-بور کی حریۃ الارادۃ کے ساتھ چند مستشرقین نے تو اتفاق کیا مگر گولڈزیہر اور واٹ جیسے مستشرقین نے دی-بور کی رائے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسئلہ عیسائیت سے نہیں بلکہ خود قرآنِ کریم سے ماخوذ ہے، (H.A. Wolfson) لکھتے ہیں:

"The Same view is repeated by Becker in 1912, by Guillaume in 1924, by Sweetman in 1945, and by Gardet and Anawati in 1948. Goldziher in 1910, Tritton in 1947, and Watt in 1948 take free will to have arisen from certain verses in the Koran Itself, but, wherease Goldziher and Tritton suggest that Christian influence hastened the development of this view in Islam, Watt denies any Christian influence." [7]

بعد کے آنے والے مستشرقین نے علمِ کلام پر عیسائیت کے اثرات کو بیان کرنے میں بالواسطہ یا بلا واسطہ دی-بور ہی کی تحقیق کو مدار بنا کر اس کی ہر سطح پر ترویج کی۔ جب کہ خود اکثر مستشرقین دی-بور کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے، بلکہ سب سے پہلے عیسائیت کے علمِ کلام پر اثرات کو جاننے کے لیے جس مستشرق نے کوشش کی یہاں ان کی رائے کو پیش کرنا زیادہ مناسب ہے۔ Fraz August Schmolders (۱۸۰۹-۱۸۸۰ء) نے ۱۸۴۲ء میں یہ سوال اٹھایا، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عیسائیت کے علمِ کلام پر کوئی اثرات نہیں تھے، وہ لکھتے ہیں:

"I find nothing precise on the origion of the *Mutakallims*. Moses Maimonide, who has of them a rather extended account, connects them with the first Christian Philosophers, maintaining that it is from them that the *Mutakallims* borrowed their arguments against the philosophers. *Shahrastani*, however, a more competent judge, says nothing about it, and the fact becomes still more improbable when one examines the very works of the *mutakallims*. We think

on th contrary that there is no relation between them and the Christain apologsits." [8]

اسی طرح Mabilleau سن ۱۸۹۵ء میں لکھتے ہیں:

"The assertion is Curious and it has nothing at the bottom but a resemblance" [9]

مندرجہ بالا نصوص سے مستشرقین کی زبانی یہ واضح ہوا کہ علمِ کلام کا عیسائیت سے مأخوذ یا متأثر ہونا اُن کے ہاں بھی کوئی متفق علیہ قول نہیں بلکہ ان میں سے محققین اس رائے کو اصلاً رد کرتے ہیں۔ اور جو اس رائے کے قائل بھی ہے وہ چوتھی صدی ہجری کے بعد کے چند مسائل کی وجہ سے یہ قول کرتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علمِ کلام کی تدوین اور اس کی ابتدائی کتب اور مراحل کے بارے میں خود مستشرقین بھی یہ نہیں کہتے کہ عیسائیت سے متأثر ہو کر مسلمان متکلمین نے علمِ کلام کی بنیاد رکھی۔

اسی خلش کو دور کرنے کے لیے ان عوامل کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی وجہ سے علم کلام کی تدوین ہوئی۔ یہ عوامل خارجی اور داخلی دو قسم کے ہیں جن کی تفصیل آ رہی ہے۔ البتہ اس مقالہ میں اس کو ضرور ثابت کیا جائے گا، کہ عوامل اگرچہ مختلف و متعدد سہی، لیکن علمِ کلام اپنے منہج، اصولوں اور طرزِ استدلال میں عیسائیت یا یونانی کتب سے مأخوذ نہیں، بلکہ اصالۃً مسلمان مفکرین و متکلمین کا سرمایۂ افتخار ہے، جنہوں نے قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرت صحابہؓ سے اصولی مباحث نکال کر اس کو ایک نئے علم کی شکل دی، اور علومِ اسلامیہ میں سے سب اشرف اور اعلیٰ علم قرار پایا[10]۔

علمِ کلام کے بنیادی عوامل کا ظہور:

علمِ کلام (تقریباً) چودہ صدیوں سے سفر کرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ جب ہم اس طویل زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو علم کلام کے نشاۃ اولیٰ کا سراغ ہمیں پہلی صدی ہجری میں ہی مل جاتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب اعتقادی مسائل میں مباحثات اور مناقشات نے جنم لینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس نے باقاعدہ مناظروں کی شکل اختیار کیا۔ جس کے اثرات سے بعض گروہ اور جماعات نہ صرف متأثر ہوئے بلکہ ان جماعات نے اپنی حرص و ہوس کو اِن مسائل کا لبادہ اوڑھ کر اختلافات کا ایک بازار گرم کیا[11]۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ جو فرقے اور جماعتیں اس مرحلے میں موجود ہوئے، اُن کی بنیاد محض علمی مباحثات اور اختلافِ رائے پر نہ تھی بلکہ اس میں سیاسی رنگ بھی کارفرما تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ

خوارج اور شیعہ کا وجود سیاسی جذبات کا نتیجہ تھا اور ان کا بنیادی ہدف علمی موشگافیاں نہیں تھی بلکہ حکومتِ وقت کی مخالفت تھی۔ تاریخِ اسلامی میں فِرق و مذاہب کے وجود کے بارے میں مختصر مگر جامع بحث حجۃ الاسلام علامہ زاہد الکوثریؒ[12] نے "تبیین کذب المفتری" کے مقدمہ میں کی ہے[13]۔

لہٰذا پہلی صدی ہجری میں ان فرق اسلامیہ کا ظہور، علم الکلام کی باقاعدہ تدوین کے بنیادی عوامل میں سے ایک اہم عامل بنا۔

علمِ کلام کے بنیادی مصادر:

گذشتہ سطور میں یہ بات گزر چکی کہ مستشرقین کی بعض تحقیقات سے ایسے افکار پھیل رہے ہیں جس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ علمِ کلام اور اس کے مباحث کا مرجع خالص اسلامی نہیں بلکہ دیگر خارجی مصادر ہیں۔ ان تحقیقات کو پرکھنے اور ان کے تنقیدی مطالعہ نے ان کو درست ثابت نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس یہ نتیجہ ثابت ہوا ہے کہ علم کلام کی بنیاد اسلامی قواعد پر ہے اور اسکی جڑیں اسلامی معاشرے ہی میں پیوست ہیں۔ اگر چہ اس کی نشونما میں دیگر عوامل بھی شامل ہیں، جو نسبتاً بعد میں آنے والے مراحل میں ظہور پذیر ہوئے۔

علم کلام پر اجنبی اثرات واضح طور پر پانچویں صدی ہجری کے بعد ہی ہوئے جب مختلف ادیان اور فلاسفہ کی طرف سے اسلام پر فلسفیانہ طرز کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوا اور عقائد اسلام کی بنیادوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش شروع ہوئی تو اس وقت حکماء اسلام اور متکلمین نے اُن کے افکار کا جائزہ لیکر اُن ہی کی زبانی ترکی بہ ترکی جوابات دیئے۔ جس سے بعد میں آنے والوں کو یہ شبہ ہونے لگا؛ کہ شاید علمِ کلام اپنے اصل ہی میں فلسفے سے لیا گیا ہے۔ لیکن یہ رائے سطحی اور زمینی حقائق سے چشم پوشی پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر علی سامی نشّار کہتے ہیں:

> "هذا العلم -فيما أعتقد- هو النتاج الخالص للمسلمين... و مما لا شكّ فيه أن المتكلمين قد كانوا في وسطٍ فلسفي و أمام هجمات فلسفية من أديان مختلفة، قد أخذوا منها بعض الأفكار الجزئية، ولكن الكلام بقي في جوهره العام حتى العام القرن الخامس إسلامياً بحتاً"[14]

"میرے خیال میں یہ علم خالص مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ متکلمین ایک فلسفی ماحول کے درمیان تھے اور مختلف ادیان کی طرف سے فلسفیانہ حملوں کا ہدف تھے اور انہوں نے بعض جزئی افکار ان سے ضرور لیے، تاہم علم کلام پھر بھی پانچویں صدی ہجری تک اپنے جوہر اور مادّے کے اعتبار سے خالص اسلامی علم رہا"۔

ذیل میں چند مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے واضح ہو گا کہ قرآن وسنت کس طرح بحوث کلامیہ کی نشات پر اثر انداز ہوئے اور ساتھ ہی اُن مباحث کا بھی اجمالاً ذکر کریں گے جو صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں بحث ومناظرہ کا محور رہے، جن کے متعلق صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے فتویٰ دیئے اور اُن کو دلائل سے رد کیا۔ یہ مباحث واستدلالات علم کلام کیلئے بیج کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شرح المقاصد میں علامہ تفتازانیؒ[15] فرماتے ہیں:

"و دخل علم علماء الصحابة بذلك فإنه كلام، و إن لم يكن سمّي في ذلك الزمان بهذا الاسم كما أن علمهم بالعمليات فقهٌ، وإن لم يكن ثمة هذا التدوين والترتيب"[16]

"علماءِ صحابہؓ کا علم اِس مباحث کلامیہ میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی علم کلام ہے اگرچہ اُس زمانے میں اِس کو یہ نام (علم کلام) نہیں دیا گیا۔ جس طرح عملیات کے بارے میں اُن کا علم "فقہ" ہے اگر چہ اُس زمانے میں فقہ کی یہ ترتیب اور تدوین نہ تھی"

قرآن کریم کا علم کلام پر اثرات:

قرآن کریم کا علم کلام پر جو اثرات ہیں اُن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چاہے وہ اثرات علم کلام کے ابتدائی دور یا اُس کے ارتقائی ادوار میں مرتب ہوئے۔

قرآن کریم مختلف جہات سے علم کلام پر اثرانداز ہوا جیسے:

1. قرآن کریم نے الوھیت، نبوت اور بعث وغیرہ کے بارے میں اسلامی عقائد کو ایسے براہین اور دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے جو عقل صحیح اور فطرت سلیمہ کو مطمئن کر دیتی ہے۔

2. قرآن کریم نے اسلامی عقائد کو ممتاز کرنے اور ان سے متعلق شبہات کو دور کرنے کے لیے اسلام کے متضاد نظریات و مذاہب: دہریت، بت پرستی، یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ جابجا مناقشات کیے۔
3. قرآن کریم نے عقل کو نظر و فکر کی دعوت دی ہے۔ بلکہ اس کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ مکمل اطمینان قلبی اور بصیرت کے ساتھ انسان ایمان سے بہرہ ور ہو۔
4. قرآنِ کریم محکم اور متشابہ دونوں قسم کی آیات پر مشتمل ہے۔ جس کی وجہ سے دوسری قسم کی آیات کی تفسیر و تشریح میں اختلاف کی گنجائش پیدا ہوئی۔

اگر ہم یہاں پر قرآن کریم کے اثرات کی پہلی حیثیت (جس میں مسائلِ اعتقادیہ کو دلائلِ عقلیہ سے ثابت کیا گیا ہے) کی بھی مختصر مثالیں پیش کریں تو اس بحث کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں:

پہلی مثال:

ا۔ توحید کے اثبات میں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ"[17]

"اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ دیگر معبود ہوتے تو ان میں فساد برپا ہوجاتا سو پاک ہے اللہ، عرش کا مالک اُن باتوں سے جو یہ بتلاتے ہیں" علماءِ متکلمین نے اِس آیت سے دلیلِ تمانع[18] کو مستنبط کیا ہے[19]۔

دوسری مثال:

۲۔ نبوت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ"[20]

"اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اُس سے راہ سجھا دیتے ہیں جس کو چاہے اپنے بندوں میں، اور بے شک تو سجھاتا ہے سیدھی راہ"

اس آیت میں صدق رسول ﷺ پر قرآن کریم کے نفسِ مضمون سے اور رسول کریم ﷺ کے بعثت کے پہلے احوال سے استدلال کیا گیا ہے اور ان سب میں اعجازِ قرآنی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسری مثال:

۳۔بعث کے متعلقہ مسائل کیلئے سورۃ یسین کی آخری آیات سے استدلال کیا جاسکتا ہے:

"قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (79) الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ "[21]

"تو کہہ اُن کو زندہ کرے گا جس نے بنایا ان کو پہلی بار اور وہ سب بنانا جانتا ہے۔جس نے بنا دی تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پھر اب تم اس سے سلگاتے ہو"

ان جیسے دیگر تمام آیات میں حکماءاور متکلمین اسلام کے لیے ایک وسیع میدان موجود ہے جس سے وہ بعث پر عقلی استدلال کرسکتے ہیں۔

علمِ کلام پر سنت نبویہ کے اثرات:

نبی اکرم ﷺ نے دین میں مناظرہ اور جدل سے مطلقاً منع نہیں فرمایا جس طرح علمِ کلام کے بعض ناقدین کا خیال ہے بلکہ ممنوع صرف وہ ہے جو تکلفاً دوسروں پر غلبہ پانے کے لیے اور دوسروں کوزبردستی غلطی اور بدعت کی طرف سے منسوب کرنے کے لئے ہو۔ آنحضرت ﷺ نے کبھی اپنے صحابہؓ کو عقائد دین کے بارے میں سوال جواب سے منع نہیں کیا الّا یہ کہ اُن مسائل تک عقل کی رسائی مشکل یانا ممکن تھی جیسے قدر وغیرہ۔

امام ابن القیمؒ[22] زاد المعاد میں تحریر فرماتے ہیں:

"وفيه دليل على أنهم كانوا يُورِدُون على رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ما يُشْكِلُ عليهم من الأسئلة والشبهات، فيُجيبهم عنها بما يُثْلِجُ صدورهم، وقد أورد عليه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الأسئلة أعداؤه وأصحابه، أعداؤه: للتعنت والمغالبة، وأصحابه: للفهم والبيان وزيادة الإيمان، وهو يُجيب كُلاً عن سؤاله إلا ما لا جواب عنه، كسؤاله عن وقت الساعة"[23]

"یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ ہر قسم کے مشکل سوالات اور شبہات کو رسول للہ ﷺ پر پیش کرتے۔ رسول اللہ ﷺ ایسے جوابات دیتے جس سے ان کا سینہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ نبی اکرم ﷺ پر اُن کے دشمنوں اور صحابہ کرامؓ دونوں نے سوالات کیے ہے۔ دشمنوں نے عداوت اور غلبہ کے لیے اور صحابہ کرامؓ نے سمجھنے اور ایمان کی زیادتی کیلئے۔ نبی اکرم ﷺ سب کو اُن کے سوالات کا جواب دیتے مگر صرف اُن سوالوں کے جواب سے خاموش رہتے جس کا کوئی جواب نہ ہوتا جیسے قیامت کے وقت کے بارے میں سوال"

سنّت ِنبویہ میں بہت سارے مسائل ِاعتقادیہ کی وضاحت اور مشرکین و اہل کتاب کے اعتراضات کا جواب ہے:

ا)ابن ہشام[24] نے اپنی کتاب میں روایت کی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے مدینہ کے یہود کے پاس رسول اللہ ﷺ کی نبوّت کے بارے میں پوچھنے کیلئے ایک وفد بھیجا تو یہود نے مشرکینِ مکہ کو نبی اکرم ﷺ کا تین سوالات میں امتحان لینے کا مشورہ دیا:

ا۔ اصحابِ کہف ۲۔ذی القرنین ۳۔روح کے بارے میں[25]

۲)علامہ ابن کثیرؒ[26] نے روایت نقل کی ہے[27] کہ جب نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

"إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ"[28]

"تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو اللہ کے سوا ،ایندھن ہے دوزخ کا تم کو اُس پر پہنچنا ہے"

جب عبداللہ بن زبعری تک یہ آیت پہنچی تو اُس نے کہا محمد(ﷺ) سے جاکر پوچھو: کیا ہر معبود اپنی عبادت کرنے والوں کے ساتھ جہنم میں ہوگا؟ ہم تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں اور یہود عزیرؑ کی اور نصاریٰ عیسیٰ بن مریمؑ کی، تو کیا یہ سب بھی جہنم میں ہونگے؟! مشرکین کو یہ گمان ہوا کہ انہوں نے غلبہ حاصل کر لیا مگر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہر وہ شخص جو یہ چاہے کہ اللہ کے سوا، اُس کی عبادت کی جائے وہ اپنے عبادت گزاروں کے ساتھ ہوگا اور یہ آیات نازل ہوئیں:

"وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَهٌ مِنْ دُونِهِ فَذَلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ) الیٰ قولہ تعالیٰ: (إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ"[29]

نبی اکرم ﷺ دلائل قرآنیہ کے ساتھ کبھی کبھی دیگر عقلی دلائل کو بھی پیش کرتے جس کی تفاصیل کتب تفسیر و حدیث میں موجود ہے۔ مثلاً وفد نجران کیساتھ مباہلہ[30] سے ثابت ہوتا ہے کہ سنّتِ مطہّرہ نے استدلالِ عقلی اور اعتقادی مسائل میں شرعی مناظرے کی بنیادیں وضع کی ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں اختلافی مسائل کے اثرات:

خلافت راشدہؓ کے ابتدائی ادوار میں بھی عامۃ المسلمین کے نظریات اور عقائد صاف شیشے کی مانند ہی رہے جو دین کے ارکان کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور اسلامی ریاست کی وسعت کے ساتھ ساتھ ایک نئی ثقافت وتہذیب کی بنیادیں ڈالنے میں مصروف تھے۔ جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور دین کے دشمنوں نے مسلمانوں کے مابین تفرقہ کا کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو دین کی بنیادوں میں دراڑیں ڈال سکے۔ ایسے نازک دور میں بہت سے زنادقہ[31] نے (جو در حقیقت یہودی تھے) اسلام کا لباس اوڑھ کر سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا۔

چنانچہ عبداللہ بن سبا[32] اوران کی طرح دیگر لوگوں کی دینِ اسلام کے خلاف سازشیں اس بارے میں میں واضح ہیں۔ جب جنگ صفّین کے بعد خوارج[33] حضرت علیؓ سے الگ ہوئے تو اُس وقت تمام فرقے پوری طرح ظاہر ہوگئے اور برملا اپنے عقائد ونظریات کا پرچار کرنے لگے[34]۔

جو نظریات اُس وقت موردِ جدل رہے ان میں سب سے مشہور یہ تھے:

۱۔ مرتکب کبیرہ کافر ہوجاتا ہے یا مسلمان ہی رہتا ہے؟

۲۔ جبر واختیار کا مسئلہ

۳۔ امامت اور خلافت کا مسئلہ

اِن تمام مسائل میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال اور فتاویٰ موجود ہیں اور خوارج کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا مناظرہ مشہور ہے[35]۔ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا اِن مسائل میں کلام اور مناظرہ علم کلام کی نشات پر براہِ راست اثرانداز ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں یہ سب مل کر علم کلام کا مبدأ اول اور بنیادی مرجع بنے۔

تدوینِ علمِ کلام اور مدوّن اول:

صحابہ کرامؓ کے دور ہی سے مختلف نظریات نے جنم لینا شروع کیا اور بعض گروہ جو فساد کی خواہاں تھی، انہوں نے ان مسائل کی نشونما کو تقویت بخشی۔ مگر باقاعدہ طور پر اِن نظریات و اعتقادات کے بارے میں بحث و مناظرے دوسری صدی ہجری کی ابتداء سے شروع ہوئے، جب ان اعتقادی مسائل میں بحث کے لیے خاص خاص حلقے بننے شروع ہوئے اور باقاعدہ اس کے لیے مجالس کے انعقاد کا اہتمام ہونے لگا اور بعض مسائل میں مناظروں کے لیے محفلیں سجنے لگیں۔ چنانچہ ہر گروہ اپنے اصول مقرر کرتے ہوئے ایک الگ مذہب کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اور سیاسی و معاشرتی سطح پر مذہب کی ترویج اور اس سے شبہات کی نفی کیلئے تگ و دو شروع کی۔

اہل حق نے کمربستہ ہوکر اسلام کے صحیح تصور کی حفاظت کی اور ہر اُس تیر کا رُخ موڑ دیا جو اسلام کے عقائد، نظریات اور معاشرت کی دیواروں کی جانب بڑھ رہا تھا انہوں نے قرآن و سنت اور صحابہ کرامؓ سے منقول قواعد کو سامنے رکھ کر باقاعدہ طور پر ایک علم کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ اس وقت اس فن کا نام علمِ کلام نہ تھا بلکہ دیگر نام تھے: جیسے الفقہ الاکبر[36]۔ علمِ کلام کی تدوین کا یہ مرحلہ (جو دوسری صدی ہجر ی کے ابتداء سے شروع ہوتا ہے) تقریباً تین صدیوں پر محیط رہا اور پانچویں صدی ہجری کے ابتداء تک یہ علم مکمل طور مدوّن ہوچکا تھا اور اس کے اصول وضوابط مقرر کیے جاچکے تھے۔

علمِ کلام کی باقاعدہ تدوین کے حوالے سے سب سے قدیم تالیفات میں سے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی کتابیں سرفہرست ہیں۔ ان قدیم کتابوں میں سے چند قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الفقہ الاکبر ۲۔ کتاب الفقہ الابسط ۳۔ العالم و المتعلّم ۴۔ رسالۃ الی عثمان البتّی

۵۔ الوصیۃ

اسی طرح امام شافعیؒ کی دو کتابوں کا ذکر بھی اس ضمن میں ملتا ہے:

۱۔ کتاب فی تصحیح النبوۃ والرد علی البراھمۃ

۲۔ کتاب فی الرد علی اھل الاھواء[37]

امام مالکؒ[38] نے بھی اپنے شاگرد امام عبداللہ بن وھبؒ[39] کے لئے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں قدریہ پر رد تھا[40]۔

خاتمہ:

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علمِ کلام یونانی فلسفہ یا عیسائیت سے متأثر ہو کر مدون نہیں ہوا، بلکہ یہ علم، دیگر علومِ اسلامیہ کی طرح خالص مسلمانوں کی فکری پیداوار ہے، اور قرآن و سنت اور صحابہ کرامؓ کے اقوال و افعال سے مأخوذ اصول و دلائل پر اس کی بنیاد ہے۔

اگرچہ بعد کے مراحل میں یونانی فلسفہ کے مباحث، اس میں ضرور شامل ہوئے مگر وہ مباحث متفقہ اسلامی اصولوں کے ساتھ متصادم نہ تھے اور فلاسفہ کے اعتراضات کو ان کی زبانی جوابات دینے کے لیے علم کلام میں مندرج ہوئے۔

علمِ کلام کی تدوین کے بارے میں یہ بات بھی تحقیق سے ثابت ہوئی ہے کہ اس کی تدوین دوسرے صدی ہجری ہی سے امام اعظم ابو حنیفہؒ کے تصانیف سے شروع ہوئے، اور بلاشبہ اُن کو اس علم کا مدون اول کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی کتابیں آج تک نہ صرف موجود و مقبول ہیں بلکہ عصری و دینی جامعات میں آج تک شاملِ نصاب ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

[1] Josef van Ess جرمن مستشرق ہیں، ان کی پیدائش ۱۸ اپریل، ۱۹۳۴ء کو آخن (Aachen) میں ہوئی۔ ۱۹۹۹ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک جرمنی کے (University of Tubingen) میں پڑھاتے رہے۔ ان کی تحقیقات کا مرکزی ہدف دوسری اور تیسری ہجری میں عقائد اور معاشرتی علوم رہا۔ متعدد اعزازات سے نوازے گئے۔ مختلف کتابیں اور مقالات لکھے۔ جس میں ۶ ضخیم جلدوں میں (A history of religious thought in early Islam) سر فہرست ہے۔ علم کلام کی تاریخ پر ان کا مقالہ (Early Development of Kalam) جرمنی زبان میں ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ G.H.A. Juynboll (1935-2010) نے (Studies on the First Century of Islamic Society) میں شائع کیا۔ دیکھئے:

David Waines, An Introduction to Islam, p:342, Unvirsity Press, Cambridge, 2nd Edition, 2003

[2] Carl Heinrich Becker (اپریل ۱۸۷۶-فروری ۱۹۳۳ء) جرمن مستشرق اور سیاسی رہنما تھے۔ (The Colonial Institute of Hamburg) میں پروفیسر تھے اور متعدد سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے متعدد علمی تصنیفات لکھی جس میں (Christianity and Islam) مشہور ہے۔

[3] Mustafa Shah, Trajectories in the Development of Islamic Theological Thought: the Synthesis of Kalam, Religion Compass, (2007) p: 430.

Livnat Hotzman, Kalam, Encylopedia Judaica, 2nd Edition, New York: Macmillan 2006, vol. 11, 729-731.

[4] Livnat Hotzman, Islamic Theology, A. Classen (ed.), De Gruyter Handbook of Medieval Studies (Berlin: de Gruyter, 2010), 1:57. H. A. Wolfson, The Philosophy of Kalam, Harveard University Press, Cambridge, 1976, p: 58-59.
Van Ess, J, 1970, 'The Logical Structure of Islamic Theology', in GE, Grunebaum, (ed.), Logic in Classical Islamic Culture, p: 21–50, Giorgio Levi Della Vida Biennial Conference, Otto Harrassowitz, Germany, University of California, Wiesbaden.

[5] Dr. T. J. De Boer, The History of Philosophy in Islam, P: 42, Translated by Edward R. Jones B.D, Luzac & Co., 40, Great Russell Street, London, 1903.

[6] H. A. Wolfson, The Philosophy of the Kalam, P: 60, Harvard University Press Cambridge, Massachusetts and London, England, 1976.

[7] H. A. Wolfson, The Philosophy of the Kalam, P: 61.

[8] Schmolders, Essai Sur Les Coles Philosophiques Chez Les Arabes Et Notamment Sur La Doctrine D Algazzali, 1842. Qouted by H. A. Wolfson in The Philosophy of the Kalam, P: 59.

[9] H. A. Wolfson, The Philosophy of the Kalam, P: 59.

[10] دیکھئے: الکتاب : الایجی، عضد الدین عبد الرحمن بن أحمد، کتاب المواقف، تحقیق: د. عبد الرحمن عمیرۃ، ۴۲/۱، دار الجیل ، بیروت، ط۱، ۱۹۹۷ء۔ التفتازانی، سعد الدین مسعود بن عمر، شرح المقاصد فی علم الکلام، ۱۱/۱، دار المعارف النعمانیہ، پاکستان، ۱۹۸۱ء

[11] ڈاکٹر حسن محمود شافعی، المدخل الی دراسۃ علم الکلام، ص: ۴۴-۴۵

[12] محمد زاھد بن حسن الحلمی الکوثری الحنفی الماتریدی (المتوفی: ۱۹۵۲ء) ترکی کے علاقہ (دوزجہ) میں پیدا ہوئی۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے قدیم کتابوں کو تحقیق و تقدیم کے ساتھ شائع کیا اور قدیم اور نادر مخطوطات کے ماہر مانے جاتے تھے۔ ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے وقت نائب شیخ الاسلام تھے اور بعد میں ہجرت کر کے مصر تشریف لے گئے اور وہی ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تصنیفات کا مجموعہ "العقیدۃ و علم الکلام" اور "الفقہ واصول الفقہ" بیروت اور پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ ان کی علمی خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً (۵۰) مستقل تصانیف کے علاوہ، ایک بڑی تعداد مقالات مقدمات اور تعلیقات کی بھی ہے۔ علامہ یوسف بنوریؒ کے ساتھ خصوصی مراسم تھے، اور حال ہی میں امام کوثریؒ اور علامہ یوسف بنوریؒ کے مابین خطوط کا ایک گراں قدر مجموعہ دار الفتح، اردن سے شائع ہوا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: ابو زہرۃ، مقدمہ مقالات الکوثری، ص/۱۴، المکتبۃ التوفیقیۃ، مصر، بدون الطبع والتاریخ۔ الزرکلی، خیر الدین، الأعلام، ۱۲۹/۶، دار العلم للملایین، ط۱۵، ۲۰۰۲ء

[13] ابن عساکر، علی بن الحسن، مقدمہ، تبیین کذب المفتری، ص: ۹ ومابعد، مکتبۃ التوفیق، دمشق، ۱۳۴۷ ہجری۔ الکوثری، مقدمات الامام الکوثری، ص: ۴۴ ومابعد، دار الثریا، بیروت، ط۱، ۱۹۹۷ء

[14] نشار، علی سامی، نشاۃ الفکر الفلسفی فی الاسلام، ۳۰/۱، دار المعارف، مصر، ط ۲، ۱۹۶۵ء

[15] سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی (المتوفی: ۷۹۳ ہجری / ۱۳۹۰ء) خراسان کے علاقہ تفتان میں پیدا ہوئے۔ علم البیان، علم العربیۃ، علم المنطق اور علم الکلام کے امام تھے۔ متعدد مشہور شروحات لکھی جن کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف درس نظامی کے نصاب میں ۴ کتابیں صدیوں سے شامل ہے۔ دیکھئے: الزرکلی، الأعلام، ۲۱۹/۷۔

[16] التفتازانی، شرح المقاصد فی علم الکلام، ۶/۱۔

[17] الانبیاء، ۲۲

[18] دلیل تمانع کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے، کہ ایک سے زیادہ معبودوں کو فرض کرنا محال کو مستلزم ہے، اور جو محال کو مستلزم ہو وہ خود بھی محال ہوتا ہے، لہٰذا ایک سے زیادہ معبودوں کا ہونا محال ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زیادہ معبود کو فرض کیا جائے تو دونوں کسی کام کو کرنے میں متفق ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ اگر وہ متفق نہ ہوں کہ ایک کسی چیز کے وجود کا ارادہ کرے اور دوسرا اس کے عدم کا، تو دونوں باتیں تو ہوں نہیں سکتی کہ اجتماعِ نقیضین لازم ہوگا، جو محال ہے، اور اگر دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو پائے تو معبودوں کا عاجز ہونا لازم ہوگا، اور وہ بھی محال ہے، اور اگر ایک بات ہو دوسری نہ ہو، تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے اور یہ بھی محال ہے۔ اور اگر وہ معبود ایک کام کو کرنے پر متفق ہوں تو اگر ایک ہی کام کو مستقلا الگ الگ کرنے پر اتفاق کریں تو اس سے ایک وقت میں وقوع المقدور من قادرین لازم آئے گا جو باطل ہے۔ اگر مستقلانہ کریں بلکہ شراکت داری سے کرنے پر اتفاق کریں تو ہر معبود کا عجز لازم آئے گا کہ مستقلا اس کو نہیں کرسکے۔ اس لیے اگر ایک سے زیادہ معبود ہوں تو ان میں بہر صورت تمانع پیدا ہوگا، جو باطل ہے۔ اس لیے ایک سے زیادہ معبودوں کا ہونا بھی باطل ہے۔ لا الہ الا اللہ۔

[19] الاشعری، علی بن اسماعیل، رسالۃ الی اہل الثغر، ص ۹۰، تحقیق عبد اللہ الشاکر الجنیدی، عمادۃ البحث العلمی، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ، ۱۴۱۳ ہجری، امام ماتریدی، ابو المنصور، تأویلات اہل السنۃ، ۳۳۶/۷، تحقیق د. مجدی باسلوم، دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۵ء، الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، ۱۳۰/۲۲، دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۰ء، التفتازانی، شرح المقاصد فی علم الکلام، ۸۵/۲، دار المعارف النعمانیہ، پاکستان، ۱۹۸۱ء۔

[20] سورۃ الشوری، آیت ۵۲

[21] سورۃ یسین، آیت: ۷۹-۸۰

[22] علامہ ابن قیم الجوزیۃ، حافظ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر الزرعی الدمشقی (۷۵۱ ہجری / ۱۳۵۰ء) ابن قیمؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ دمشق کے قریب زرع نامی گاؤں میں ان کی ولادت ہوئی۔ علامہ ابن تیمیہؒ کے نامور شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، جھبیس سالوں تک ابن قیمؒ اپنے استاد کے ساتھ رہے، بلکہ ان کے ساتھ محبت و تعلق کا یہ عالم ہے کہ جن جن مسائل میں علامہ ابن تیمیہؒ کے تفردات ہیں، ان کو نہ صرف اپنایا، بلکہ ان کی شرح اور دفاع میں مصروف رہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ (۶۰) سے زیادہ ہے۔ دیکھئے: جمال بن محمد السید، ابن قیم الجوزیۃ وجہودہ فی خدمۃ السنۃ النبویۃ وعلومہا، ص ۸۱/۱، عمادۃ البحث العلمی بالجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ، ط ۲۰۰۴ء۔ ابن رجب، ذیل طبقات الحنابلۃ،

۴۴۷/ ۲، تحقیق: محمد حامد الفقی، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، قاہرۃ، ۱۳۷۲ہجری۔ ابو المحاسن الدمشقی، محمد بن علی، ذیل العبر فی خبر من غبر، ص: ۲۸۲/ ۵، تحقیق: ابوہاجر محمد بسیونی زغلول، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط۱، ۱۹۸۵ء

[23] ابن قیّم الجوزیۃ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، ۶۸۰/ ۳، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ط۲۷، ۱۹۹۴ء

[24] ابو محمد عبد الملک بن ہشام الحمیری (المتوفی ۲۱۸ہجری/ ۸۳۳ء) ایک مشہور مسلم مؤرخ اور محدث تھے جو بصرہ میں پیدا ہوئے اور (فسطاط) قاہرہ میں وفات پائی۔ نامور مؤرخ اور نحوی تھے۔ اس کی اہم تالیف سیرت رسول اللہ ﷺ ہے جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اس نے ابن اسحاق کی کتاب المغازی والسیر کی مدد سے ترتیب دی ہے۔ سھیلی، عبد الرحمن بن عبد اللہ، الروض الأنف فی شرح السیرۃ النبویۃ، ۱۵/ ۱، تحقیق: عمر عبد السلام السلامی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ط۱، ۲۰۰۰ء

[25] ابن ھشام، سیرۃ ابن ھشام، ۳۱۵-۳۲۲/ ۱، دار احیاء التراث، بیروت، ۱۳۹۱ہجری

[26] ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر (المتوفی: ۷۷۴ہجری/ ۱۳۷۳ء) ایک معزز اور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد حفص شہاب الدین عمر اپنی بستی کے خطیب تھے اور بڑے بھائی شیخ عبد الوہاب ایک ممتاز عالم اور فقیہ تھے۔ حافظ ابن کثیر کی ولادت بصریٰ کے نواحی علاقے (مجدل) میں ہوئی۔ تمام عمر آپ کی درس و افتاء، تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ حافظ ذہبیؒ کی وفات کے بعد مدرسہ ام صالح اور مدرسہ تنکریہ میں آپ شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کی مشہور تصانیف میں "تفسیر القرآن الکریم" جو تفسیر ابن کثیر کے نام سے معروف ہے، اور اس کے اردو زبان میں کئی تراجم بھی ہیں۔ الزرکلی، الأعلام، ۳۲۰/ ۱۔

[27] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۳۷۹/ ۵، ۲۳۳/ ۷، تحقیق: سامی بن محمد سلامۃ، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، مدینہ منورہ، ط۲، ۱۹۹۹ء

[28] سورۃ الانبیاء، آیت: ۹۸

[29] سورۃ الانبیاء: آیت: ۲۹ تا ۱۰۱

[30] مثال کے طور پر دیکھیں: الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب (تفسیرِ کبیر)، ۱۳۴/ ۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ط۱، ۲۰۰۰ء۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۳۲۲/ ۱۔

[31] الکوثری، مقدمۃ تبیین کذب المفتری، مقدمات الکوثری، ۴۳۔

[32] عبد اللہ بن سبأ (المتوفی ۴۹ہجری/ ۶۶۰ء) سبائی فتنہ کے بانی اور الوھیت علیؓ کا قائل تھا۔ یمن سے تعلق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اصل میں یہودی تھا مگر اسلام ظاہر کرتا تھا۔ حجاز، بصرہ، کوفہ، مصر اور دمشق سفر کیا۔ "ابن السوداء" کے نام سے معروف تھے۔ علامہ ابن حجر العسقلانیؒ نے تحریر کیا ہے: "ابن سبأ، غالی زندیق تھے، میرا گمان ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو جلا کر ہلاک کیا تھا"۔ دیکھئے: العسقلانی، ابن حجر، لسان المیزان، ۲۸۹/ ۳، مؤسسۃ الاعلمی، بیروت، ط۳، ۱۹۸۶ء۔ الھلابی، ڈاکٹر عبد العزیز صالح، عبد اللہ بن سبأ دراسۃ للروایات التاریخیہ عن دورہ فی الفتنہ، حولیات کلیۃ الآداب، الحولیۃ الثامنۃ، جامعۃ الکویت، ۱۹۸۷ء

[33] خوارج: اسلام میں پہلا مذہبی سیاسی فرقہ جس نے شعائر سے ہٹ کر اپنا الگ گروہ بنایا۔ ان کا ظہور جنگِ صفین کے موقع پر ہوا، جب حضرت علیؓ کی فوج سے اس وجہ سے الگ ہو گئے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی ثالثی کی تجویز کو قبول کر لیا۔ ان کا مشہور نعرہ "ان الحکم الا للہ" (حاکمیت اللہ ہی کے لیے ہے) تھا۔ "حروراء" کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور کوفہ، مدائن اور بصرہ وغیرہ میں اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کی۔ حضرت علیؓ نے خارجیوں کو جنگ نہروان میں شکست فاش دی۔ صحیح بخاری (کتاب المغازی، حدیث: ۴۰۹۴) اور مسلم (کتاب الزکاۃ، حدیث: ۱۰۶۴) کی روایت کے مطابق خوارج کا جد امجد ذوالخویصرہ تمیمی تھا، جو نبی اکرم ﷺ کے گستاخی سے پیش آیا، جس پر انہوں نے اسے سخت وعید فرمائی، اور فرمایا: "اس کی پشت سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو اللہ کی کتاب کی تلاوت سے زبان تر رکھیں گے، لیکن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے پار ہوتا ہے"۔

[34] الکوثری، مقدمۃ تبیین کذب المفتری، مقدمات الکوثری، ۴۳۔

[35] دیکھئے: الصنعانی، عبد الرزاق بن ہمام، مصنف عبد الرزاق، باب ما جاء فی الحروریۃ، ۱۵۷/۱۰، رقم الحدیث: ۱۸۶۷۸، تحقیق: حبیب الرحمٰن اَعظمی، المکتب الاسلامی، بیروت، ط ۲، ۱۴۰۳ ہجری۔ النیسابوری، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم، المستدرک علی الصحیحین، کتاب قتال اَہل البغی، ۱۶۴/۲، رقم الحدیث: ۲۶۵۶، تحقیق: مصطفی عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط ۱، ۱۹۹۰ء

[36] البیاضی، کمال الدین احمد الحنفی، اشارات المرام من عبارات الامام، ص: ۳۰، تحقیق: یوسف عبد الرزاق الشافعی، زمزم پبلشرز، کراچی، ط ۱، ۲۰۰۴ء۔ الایجی، کتاب المواقف، ۶/۱۔

[37] دیکھئے: البغدادی، عبد القاہر، اصول الدین، ص: ۳۰۹، مطبعۃ الدولۃ، استانبول، ط ۱، ۱۹۲۸ء

[38] مالک بن انس بن مالک الاصبحی الانصاری، امام دار الھجرۃ، اہل السنہ والجماعۃ کے چار فقہی مذاہب میں سے مالکیہ کے بانی ہیں۔ اساتذہ میں نافع مولی ابن عمرؓ، امام زہری، ربیعۃ الرأی جیسے ائمہ کرام سے تحصیلِ علم کیا۔ روایتِ حدیث اور فتوی دینے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ فقہ میں کتاب و سنت کے بعد، عمل اَہل المدینۃ سے استدلال کرنے میں مشہور ہوئے۔ امام مالکؒ کی موطا، متعدد شاگردوں کی روایت سے آج تک مقبول عام ہے۔ دیکھئے: العسقلانی، تھذیب التھذیب، ۵/۱۰، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۴ء، ط ۱۔ ابن خلکان، وفیات الأعیان، ۴۳۹/۱، تحقیق احسان عباس، دار صادر، بیروت

[39] ابو محمد عبد اللہ بن وھب بن مسلم الفھری المصری، (المتوفی: ۱۹۷ ہجری/۸۱۳ء) امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور مالکیہ کے فقیہ ائمہ میں سے ہیں۔ ثقہ اور مجتہد تھے۔ فقہ و حدیث کے جامع شخصیت تھے۔ موطا کے راوی ہیں۔ الذھبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲۲۲/۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۸ء۔ ابن خلکان، وفیات الأعیان، ۳۶/۳۔

[40] دیکھئے: القاضی عیاض، ترتیب المدارک و تقریب المسالک، ۹۰/۲، تحقیق: محمد بن تاویت الطنجی، وزارۃ الاوقاف و الشؤون الاسلامیۃ، المملکۃ المغربیۃ، ط ۲، ۱۹۸۳ء۔ السیوطی، بغیۃ الوعاۃ، ۹۱/۲، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم، المکتبۃ العصریۃ، لبنان، بدون الطبع والتاریخ۔